رسائل و مسائل

اسلامی ریاست کے امکانات اور اس میں ذمی رعایا کی حیثیت

ترجمان القرآن کے گذشتہ نمبر کے "رسائل و مسائل" میں اس مسئلے کے متعلق ایک ہندو دوست کا مراسلہ مع جواب درج ہو چکا ہے۔ اب انہی صاحب کے مزید دو خطوط (غیر متعلق امور کے حذف کے بعد) مع جواب درج کیے جاتے ہیں:۔

سوال: آپ کی چند تصانیف و عنایت نامہ پڑھنے کے بعد میں یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہیں اور اس اسلامی حکومت کے عہد میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسی ہندوؤں میں اچھوتوں کی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہندوؤں کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی، ان کو مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا"۔ مگر آپ نے یہ نہیں تحریر فرمایا کہ آیا ہندوؤں کو تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جو بھی اس حکومت کے اصول کو تسلیم کرے وہ اس کے چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے، خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ"۔ براہ کرم اس کی توضیح کیجیے کہ ایک ہندو ہندو رہتے ہوئے بھی کیا آپ کی حکومت کے اصولوں پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہو سکتا ہے؟

پھر آپ نے فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں مگر آپ نے ساتھ ہی یہ واضح نہیں کیا کہ آیا اہل کتاب بھی مسلم عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا آپ اس احساس برتری (Superiority complex) کے بارے میں مزید روشنی ڈالیں گے؟ اگر آپ اس کے اثبات (Justification) کے لیے اسلام پر ایمان کی اوٹ لیں تو کیا آپ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ موجودہ نام نہاد مسلمان آپ کے قول کے مطابق ان اسلامی قواعد اور کیرکٹر کے اصولوں پر پورے اتریں گے؟ آج کے مسلمان کی بات تو الگ رہی، کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ خلافت راشدہ کے عہد میں اکثر و بیشتر جو لوگ اسلام لائے وہ زیادہ تر سیاسی اقتدار کے خواہاں تھے؟ اگر آپ یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں تو فرمائیے کہ پھر وہ اسلامی حکومت کیوں صرف تیس پینتیس سال چل کر رہ گئی؟ پھر کیوں حضرت علیؓ جیسے مدبر اور مجاہد کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی اور مخالفین میں حضرت عائشہ صاحبہ تک تھیں؟

آپ حکومت الٰہیہ کے خواہاں ہوتے ہوئے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنی حکومت الٰہیہ ملکی حدود کے بغیر ہی نافذ کر سکیں گے؟ یقیناً نہیں! تو پھر آپ کی حکومت الٰہیہ کے لیے ملکی حدود بہرحال وہی موزوں ہو سکتی ہیں جہاں مسٹر جناح اور ان کے حواری پاکستان کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ آپ پاکستان کی حدود کے علاوہ کیوں سارے ہندوستان میں حکومت الٰہیہ نافذ کریں گے؟ نیز یہ گرہ بھی کھولیے کہ آپ موجودہ ماحول میں اس طرز حکومت کو چلانے کے لیے ایسے بلند اخلاق اور بہترین کیرکٹر کی شخصیتیں کہاں سے پیدا کریں گے؟ جبکہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان غنی جیسے عدیم المثال بزرگ اسے چند سالوں سے زیادہ نہ چلا سکے۔ چودہ سو سال کے بعد ایسے کون سے موافق حالات آپ کے پیش نظر ہیں جن کی بنا پر آپ کی دور رس نگاہیں حکومت الٰہیہ کو عملی صورت میں دیکھ رہی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آپ کا پیغام ہر خیال کے مسلمانوں میں زور و شور سے پھیل رہا ہے اور مجھے جس قدر بھی مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ سب اس خیال کے حامی ہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ عین اسلام ہے، مگر ہر شخص کا اعتراض یہی ہے جو میں نے گذشتہ سطور میں پیش کیا ہے، یعنی آپ کے پاس عہد خلافت

راشدہ کی اصولی حکومت چلانے کے لیے فی زمانہ کیرکٹر کے آدمی کہاں ہیں؟ پھر جبکہ وہ بہترین نمونہ کی ہستیاں اس نظام کو نصف صدی تک بھی کامیابی سے نہ چلا سکیں تو اس دور میں اس طرز کی حکومت کا خیال خوش فہمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

علاوہ بریں ایک چیز اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ مدت پہلے میرا یہ خیال تھا کہ صرف ہم ہندوؤں ہی میں ایک مشترک نصب العین نہیں ہے، بخلاف اس کے مسلمانوں میں اجتماعی زندگی ہے اور ان کے سامنے واحد نصب العین ہے۔ لیکن اب اسلامی سیاست کا بغور مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کا حال ہم سے بھی دگرگوں ہے۔ آپ سے چھپاؤں گا نہیں، میں نے تقریباً مختلف مراکز فکر کے مسلم رہنماؤں سے ان کے نصب العین اور طریقۂ کار کے بارے میں ایک متلاشیٔ حق کی حیثیت سے چند ایک امور جو میرے لیے تحقیق طلب تھے دریافت کیے۔ ان کے جوابات موصول ہونے پر میرا پہلا خیال غلط نکلا اور معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں بھی طریقۂ کار اور نصب العین کے بارے میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔

(اس موقع پر جناب مستفسر نے جماعت اسلامی سے اختلاف رکھنے والے بعض اصحاب کی تحریروں سے چند سطور نقل کی ہیں۔ انھیں حذف کیا جاتا ہے)

ملاحظہ فرمایا آپ نے، آپ کے مشترک العقیدہ رہنما کس شدید اختلاف آرا میں مبتلا ہیں۔ ان ٹھوس حقائق اور واقعات کو نظرانداز کرکے محض کتابوں کے صفحات پر ایک چیز کو نظریہ کی شکل میں پیش کر دینا اور بات ہے اور اسے عملی جامہ پہنانا قطعاً مختلف چیز ہے۔ سیاست ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ کیا آپ میرے اس سارے التماس کو سامنے رکھ کر اپنے طریقۂ کار اور راہ عمل سے بہ تفصیل مطلع فرمائیں گے؟

جواب: آپ کے سوالات کا سرا حقیقت میں ابھی تک میں نہیں پاسکا ہوں، اس وجہ سے جو جوابات میں دیتا ہوں ان میں سے کچھ اور ایسے سوالات نکل آتے ہیں جن کے نکلنے کی مجھے توقع نہیں ہوتی۔ اگر آپ پہلے بنیادی امور سے بات شروع کریں اور پھر بتدریج فروعی معاملات اور وقتی سیاسیات (Current Politics) کی طرف آئیں تو چاہے آپ مجھ سے متفق نہ ہوں لیکن کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ ضرور لیں گے۔ سردست تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری پوزیشن آپ کے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہے۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "جس اسلامی حکومت کا میں خواب دیکھ رہا ہوں اس میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت وہی ہوگی جو ہندوؤں میں اچھوتوں کی ہے"۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یا تو آپ ذمیوں کی حیثیت میرے صاف صاف بیان کر دینے کے باوجود نہیں سمجھے ہیں یا ہندوؤں میں اچھوتوں کی حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ اول تو اچھوتوں کی جو حیثیت منو کے دھرم شاستر سے معلوم ہوتی ہے اس کو ان حقوق و مراعات سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اسلامی فقہ میں ذمیوں کو دیے گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھوت پن کی بنیاد نسلی امتیاز پر ہے اور ذمیت کی بنیاد محض عقیدہ پر۔ اگر ایک ذمی اسلام قبول کرلے تو وہ ہمارا امیر امام تک بن سکتا ہے۔ مگر کیا ایک شودر کسی عقیدہ و مسلک کو قبول کر لینے کے بعد ورن آشرم کی پابندیوں سے بری ہو سکتا ہے؟

آپ کا یہ سوال کہ "آیا ہندوؤں کو اسلامی ریاست میں تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں"، جتنا مختصر ہے اس کا جواب اتنا مختصر نہیں ہے۔ تبلیغ کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ خود اپنی آئندہ نسلوں کو اور اپنے عوام کو اپنے مذہب کی تعلیم دے۔ اس کا حق تمام ذمی گروہوں کو حاصل ہوگا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے اپنے مذہب کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور اسلام سمیت دوسرے مسلکوں سے اپنے وجوہ اختلاف کو علمی حیثیت سے بیان کرے۔ اس کی اجازت بھی ذمیوں کو ہوگی، مگر ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک منظم تحریک ایسی اٹھائے جس کی غرض یا جس کا مآل یہ ہو کہ ملک کا نظام زندگی تبدیل ہو کر اسلامی اصولوں کے بجائے اس کے اصولوں پر قائم ہو جائے۔ ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی کو نہیں دیں گے۔ اس مسئلے پر میرا مفصل مضمون "اسلام میں قتل مرتد کا حکم" ملاحظہ فرمائیے۔

اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز اور مسلمان عورتوں سے اہل کتاب کا نکاح ناجائز ہونے کی بنیاد کسی احساس برتری پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ مرد بالعموم متاثر کم ہوتا ہے اور اثر زیادہ ڈالتا ہے۔ عورت بالعموم متاثر زیادہ ہوتی ہے اور اثر کم ڈالتی ہے۔ ایک غیر مسلمہ اگر کسی مسلمان کے نکاح میں آئے تو اس کا امکان کم ہے کہ وہ اس مسلمان کو غیر مسلم بنالے گی اور اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان عورت اگر کسی غیر مسلم کے نکاح میں چلی جائے تو اس کے غیر مسلمہ ہو جانے کا بہت زیادہ اندیشہ ہے اور اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اور اپنی اولاد کو مسلمان بنا سکے گی۔ اسی لیے مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کا نکاح غیر مسلموں سے کریں۔ البتہ اگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص اپنی بیٹی مسلمان کو دینے پر راضی ہو تو مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اس چیز کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دے دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم بیوی کی محبت میں مبتلا ہو کر تم نے ایمان کھو دیا تو تمھارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا اور آخرت میں تم خسارے میں رہو گے۔ نیز یہ اجازت ایسی ہے جس سے خاص ضرورتوں کے مواقع پر ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے جسے قبول عام حاصل ہو بلکہ بعض حالات میں تو اسے روکا بھی گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں غیر مسلم عناصر کے داخل ہونے سے کسی نامناسب اخلاقی اور اعتقادی حالت کا نشو و نما نہ ہو سکے۔

آپ کا یہ سوال کہ اسلامی حکومت صرف تیس پینتیس سال چل کر کیوں رہ گئی ایک اہم تاریخی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اگر آپ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو اس کے اسباب سمجھنا آپ کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ کسی خاص اصول کی علمبردار جماعت جو نظام زندگی قائم کرتی ہے اس کا اپنی پوری شان کے ساتھ چلنا اور قائم رہنا اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ لیڈر شپ ایک ایسے چیدہ گروہ کے ہاتھ میں رہے جو اس اصول کا سچا اور سرگرم پیرو ہو۔ اور لیڈر شپ ایسے گروہ کے ہاتھ میں صرف اسی حالت میں رہ سکتی ہے جبکہ عام باشندوں پر اس گروہ کی گرفت قائم رہے اور ان کی عظیم اکثریت کم از کم اس حد تک تعلیم و تربیت پائی ہوئی ہو کہ اسے اس خاص اصول کے ساتھ گہری وابستگی بھی ہو اور وہ ان لوگوں کی بات سننے کے لیے تیار بھی نہ ہو جو اس اصول سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقہ کی طرف بلانے والے ہوں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو تمدنی انقلاب رونما ہوا اور جو نیا نظام زندگی قائم ہوا اس کی بنیاد یہ تھی کہ عرب کی آبادی میں ایک طرح کا اخلاقی انقلاب (Moral revolution) واقع ہو چکا تھا اور آنحضرت کی قیادت میں صالح انسانوں کا جو مختصر گروہ تیار ہوا تھا اس کی قیادت تمام اہل عرب نے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن آگے چل کر عہد خلافت راشدہ میں جب ملک پر ملک فتح ہونے شروع ہوئے تو اسلام کی مملکت میں توسیع بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور استحکام اتنی تیزی کے ساتھ نہ ہو سکا۔ چونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت اور تعلیم و تبلیغ کے ذرائع اتنے نہ تھے جتنے آج ہیں اور نہ وسائل حمل و نقل موجودہ زمانہ کے مانند تھے، اس لیے جو فوج در فوج انسان اس نئی مسلم سوسائٹی میں داخل ہونے شروع ہوئے ان کو اخلاقی، ذہنی اور عملی حیثیت سے اسلامی تحریک میں مکمل طور پر جذب کرنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام آبادی میں صحیح قسم کے مسلمانوں کا تناسب بہت کم رہ گیا اور خام قسم کے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ لیکن اصولاً ان مسلمانوں کے حقوق اور اختیارات اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت صحیح قسم کے مسلمانوں کی بہ نسبت کچھ بھی مختلف نہ ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے جب حضرت علیؓ کے زمانہ میں جوابی انقلاب کی تحریکیں Counter-revolutionary movements رونما ہوئیں تو مسلمان پبلک کا ایک بہت بڑا حصہ ان سے متاثر ہو گیا اور لیڈر شپ ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گئی جو ٹھیٹھ اسلامی طرز پر کام کرنے والے تھے۔

اس تاریخی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ واقعہ ذرہ برابر بھی دل شکستہ نہیں کرتا کہ خالص اسلامی حکومت تیس پنتیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت، اس اخلاق اور اس سیرت کے انسانوں کا منظم کر سکیں جو اسلام کے منشار کے مطابق ہو تو ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے ذرائع و وسائل سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی و تمدنی انقلاب برپا کر سکیں گے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایسے گروہ کے منظم ہو جانے کے بعد عام انسانوں کی قیادت اس گروہ کے سوا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی۔ آپ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر جو رائے قائم کر رہے ہیں وہ اس حالت پر چسپاں نہیں ہو سکتی جو ہمارے پیش نظر ہے۔

اگر صحیح اخلاق کے حامل انسان میدان عمل میں آجائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ ہندو، عیسائی، پارسی اور سکھ سب ان کے گرویدہ ہو جائیں گے اور خود اپنے ہم مذہب لیڈروں کو چھوڑ کر ان پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ ایسے ہی ایک گروہ کو تربیت اور تعلیم اور تنظیم کے ذریعہ سے تیار کرنا اس وقت میرے پیش نظر ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کام میں وہ میری مدد کرے۔

حکومت الٰہیہ اور پاکستان کے فرق کے متعلق جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا جواب آپ میری کتابوں میں پا سکتے تھے مگر وہ شاید آپ کی نظر سے نہیں گذریں۔ پاکستان کی بنیاد قومیت کے اصول پر ہے، یعنی مسلمان قوم کے افراد جہاں اکثریت میں ہوں وہاں انھیں اپنی حکومت قائم کرنے کا حق حاصل ہو۔ بخلاف اس کے حکومت الٰہیہ کی بنیاد اسلام کا اصول ہے۔ پاکستان صرف ان لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے جو صرف مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن حکومت الٰہیہ کی دعوت تمام انسانوں کو اپیل کر سکتی ہے، خواہ وہ پیدائشی مسلمان ہوں یا پیدائشی ہندو یا کوئی اور۔ پاکستان صرف وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور اس بات کی بہت کم توقع ہے کہ پاکستان کی حکومت خالص اسلامی حکومت ہوگی، کیونکہ خالص اسلامی حکومت کا قیام جس اخلاقی انقلاب پر منحصر ہے وہ پاکستان کی تحریک سے رونما نہیں ہو سکتا۔ لیکن حکومت الٰہیہ اس کی محتاج نہیں ہے کہ کسی جگہ مسلمان قوم کی اکثریت پہلے سے موجود ہو۔ وہ تو ایک اخلاقی اور ذہنی اور تمدنی انقلاب کی دعوت ہے اور سارے انسانوں کے لیے خود انہی کی فلاح کے چند اصول پیش کرتی ہے، اس دعوت کو اگر پنجاب یا سندھ سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول کر لیں تو حکومت الٰہیہ یہاں قائم ہو سکتی ہے اور اگر مدراس یا بمبئی یا کوئی دوسرا علاقہ پیش قدمی کر کے اسے قبول کرے تو حکومت الٰہیہ وہاں قائم ہو سکتی ہے۔ ہم اس دعوت کو مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، ہر ایک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مسلمانوں کی کوئی قومی جائداد نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کی فلاح کے چند اصول ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پیدائشی مسلمان اس دعوت کو قبول کرنے میں کوتاہی دکھائیں اور پیدائشی ہندو آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیں۔

آپ کا یہ سوال بالکل عجیب ہے کہ کیا ایک شخص ہندو ہوتے ہوئے ان اصولوں پر ایمان لے آئے تو آپ اسے برابر کا حصہ دار بنا سکیں گے؟ ظاہر ہے کہ جو شخص ہمارے ان اصولوں پر ایمان لے آئے گا وہ ہندو کب رہے گا، وہ تو مسلمان ہو جائے گا۔ ان اصولوں پر ایمان لے آنا ہی تو مسلمان ہو جانا ہے۔ اور جو مسلمان ہو گیا وہ یقیناً ہمارے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

آپ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں میں ایک مشترک مقصد اور نصب العین کا فقدان ہندوؤں سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ ہے اسلام سے بے نیاز ہو کر دنیوی معاملات کو خواہشات نفس اور غیر مسلم طور طریقوں کی تقلید سے حل کرنے کی کوشش کا۔

اگر مسلمان خالص اسلامی اصول پر اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تو آپ ان کو ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین کے پیچھے اپنی ساری قوتیں صرف کرتے ہوئے پاتے۔ آپ نے مسلمانوں کے اندر خیالات اور اعمال کا جو انتشار محسوس کیا ہے اسے میں بھی ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور ہماری اسلامی تحریک کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا جو رویہ ہے وہ بھی میری نگاہ میں ہے، مگر ان چیزوں سے میرے اندر کوئی بددلی پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ ان باتوں کی تہ میں جو اصل خرابی ہے اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ میں بددل نہیں ہوں بلکہ ایک بڑی حد تک پر امید ہوں۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی تحریر فرمایا ہے، مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تیزی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرتا جارہا ہے کہ جو چیز میں پیش کر رہا ہوں یہی اصلی اور خالص اسلام ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے موجودہ مختلف گروہ جس طرز پر کام کر رہے ہیں اس سے ان کا کامیابی کی منزل تک پہنچنا تقریباً محال ہے۔ لہٰذا اس امر کا قوی امکان ہے کہ مستقبل قریب میں مسلمان نوجوان ان مختلف گروہوں سے اور ان کی سیاست سے مایوس ہو جائیں گے اور ان کے لیے خالص اسلام کے اصول پر کام کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوؤں میں بھی جب قوم پرستی، سیاسی آزادی کی منزل پر پہنچ جائے گی تو انھیں سیاست اور معاشرت اور تمدن کی مشینری کو چلانے کے لیے کچھ اصول درکار ہوں گے اور وہ گاندھی جی کے فلسفے یا ہندو مہاسبھا کی نری قوم پرستی میں نہ مل سکیں گے۔ اس وقت ان کے لیے صرف دو ہی راستے ہوں گے، یا تو اشتراکیت کے اصولوں کو اختیار کریں یا پھر اسلام کے اصولوں کو قبول کرلیں۔ اس موقع کے پیش آنے تک اگر ہم اصول اسلام کے بے لاگ داعیوں کا ایک صالح گروہ منظم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو مجھے ۸۰ فیصدی امید ہے کہ ہم اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کو اشتراکیت سے بچانے اور اسلام کے اصولوں کی طرف کھینچ لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہمارے اس مقصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان موجودہ قومی کشمکش ہے۔ مگر ہم امید کرتے ہیں کہ جس طریقہ پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں اس سے ہم ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری غیر مسلم قوموں کے اس تعصب کو جو وہ موجودہ مسلمانوں کی غلط روش کی وجہ سے اسلام کے خلاف رکھتے ہیں بالآخر دور کر دیں گے اور انھیں اس بات پر آمادہ کرلیں گے کہ وہ اسلام کو خالص اصولی حیثیت سے دیکھیں، نہ کہ اس قوم کے مذہب کی حیثیت سے جس کے ساتھ دنیوی اغراض کے لیے ان کی مدتوں سے کشمکش برپا ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت میں فرقوں کی حیثیت

سوال: ۔ حکومت الٰہیہ میں شیعوں کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: ۔ اس مسئلہ میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ ابھی تک میں خود اپنے ذہن میں بھی اسے پوری طرح نہیں سلجھا سکا ہوں۔ مشکل پر مزید مشکل یہ ہے کہ تاریخ کے جس دور کو ہم اپنے لیے شمع ہدایت سمجھتے ہیں وہاں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور نہ کتاب و سنت میں کوئی اصولی ہدایت ایسی ملتی ہے جس سے بآسانی ہم اس مسئلہ کو سلجھا سکیں۔ دورِ نبوت میں تو ظاہر ہے کہ سب مسلمان ایک ہی گروہ تھے اور اصول کیا معنی، فروع میں بھی ان کے درمیان اختلافات نہ تھے۔ اس کے بعد دورِ خلافت آیا اور اس میں بھی بیشتر فروعی اختلافات تھے۔ اصولی اختلافات رکھنے والے فرقوں کا وجود نہ تھا۔ حضرت علیؓ کے زمانہ میں بلاشبہہ خوارج کا ظہور ہوا جنھوں نے

اصولی اختلاف کا اظہار کیا۔ لیکن ان کے عہد میں بات اپنی انتہا کو نہیں پہنچی تھی جس سے یہ امر متحقق ہو سکتا کہ اگر مسلمانوں کی جماعت (Main body of Islam) میں کوئی اصولی اختلاف رکھنے والا فرقہ پیدا ہو جائے تو جماعت یا بالفاظ دیگر سوادِ اعظم کو اسے اپنے اندر کس حد تک اور کس حیثیت سے جگہ دینی چاہیے۔ حضرت علیؓ کے بعد کا کوئی دور ایسا نہیں ہے جو ہمارے نزدیک نظیر کی حیثیت رکھتا ہو۔ رہی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ، تو وہاں سرے سے فرقوں کے وجود ہی کو جائز تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو فرقے جمہور سے اصولی اختلاف رکھتے ہیں اسلامی حکومت میں ان کی کیا حیثیت قرار پانی چاہیے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ہماری اس تحریک کے علمی اور عملی نشو و نما سے اس کا کوئی حل خود بخود نکل آئے یا کم از کم ہمارے سامنے کوئی ایسی روشنی نمودار ہو جائے جس سے ہم اس مسئلہ کو بآسانی حل کر سکیں۔ آپ نے اگر اس معاملہ میں کوئی بات سوچی ہے تو میں آپ کا شکر گذار ہوں گا اگر آپ مجھے اس سے مطلع فرمائیں گے۔

احادیث کی تحقیق میں اسناد اور تفقہ کا دخل

نوٹ:۔ گذشتہ اشاعت کے رسائل و مسائل میں "تقلید و عدم تقلید" کے عنوان سے جو خط و کتابت درج کی گئی تھی اس سلسلہ میں مزید مراسلت یہاں درج کی جاتی ہے تاکہ ناظرین اس بحث کے مفید پہلوؤں سے استفادہ کر سکیں۔ اگرچہ صاحبِ مراسلہ اب اس معاملہ میں مطمئن ہو چکے ہیں کہ ان اختلافات کو ان کی حد میں رکھ کر اقامت دین کے لیے مشترک جد و جہد کی جا سکتی ہے، لیکن جن دوسرے لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے مسائل کھٹک پیدا کر رہے ہیں ان کی معلومات کے لیے اس مراسلت کی اشاعت ضروری ہے۔

سوال:۔ خط و کتابت کے کئی مراحل طے ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک کوئی اطمینان بخش صورت ظاہر نہ ہو سکی۔ تاہم اس خط سے محض ایک سوال کے حل پر ساری بحث ختم ہو سکتی ہے۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ حدیث و فقہ کا ہم پلہ ہونا، اسناد و حدیث میں خامیوں کا پایا جانا وغیرہ وغیرہ میں آپ کی نظر میں بنیادی ہیں یا فروعی؟ —— اگر اصولی اور بنیادی ہیں جیسا کہ جماعت کے مستقل کتابی لٹریچر میں اس کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے تو پھر کسی مخالفت کا اندیشہ کیے بغیر جماعت اہل حدیث روایت کے باب میں جو غلو رکھتی ہے اس کی اصلاح و تنقید کے لیے پورا زورِ قلم صرف کیجیے، جیسا کہ آپ نے لیگ اور کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے کیا ہے۔ باقی رہا جماعت کے اندر اور باہر بحث کا دروازہ کھل جانے کا اندیشہ تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی کیونکہ اب سے پہلے بھی اخبار اہلحدیث امرتسر میں تصدیق الحدیث کے عنوان سے اس پر تنقید ہو چکی ہے اور اب بھی ایک مولوی صاحب .... میں تفہیمات کے اقتباسات ("مسلک اعتدال") سنا سنا کر جماعتِ اسلامی کے ہم خیال اہل حدیث افراد میں بددلی پیدا کر رہے ہیں اور پوری طرح فتنہ کا سامان ہو گیا ہے اور جماعتی ترقی میں مزاحمت ہو رہی ہے۔

لیکن اگر یہ مضامین فروعی اور ضمنی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ آپ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے تو پھر تفہیمات جیسی (اصولی اور اہم کتاب اور مستقل لٹریچر کی صورت میں ان پر اتمام و تفہیم کی ضرورت نہ تھی، اس کے لیے صرف ترجمان القرآن کے صفحات کافی تھے۔ افسوس کہ جس چیز کو آپ فروعی تحریر فرماتے ہیں وہی جماعتی توسیع کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ خود آپ ہی دستور جماعت کی دفعہ ۵ جزء (د) میں تحریر فرماتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے رکن کے لیے ان تمام بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا ضروری ہے جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غیر اہم کو اہم بنایا جا رہا ہے اور اس کے لیے تفہیمات کے صفحے کے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں؟ کیا اس سے بڑھ کر کوئی بنیادی اصلاح کا کام باقی ہی نہ رہا تھا؟

پھر یہاں دو جدا جدا چیزیں ہیں جنھیں مخلوط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ فقہی جزئیات کی تعمیل میں کتاب و سنت کے ماتحت مختلف ہونا الگ معاملہ ہے اور اسے برداشت کیا جاسکتا ہے یعنی اس بارے میں بنیادی امور کے اشتراک و اتحاد کے لیے رواداری برتی جاسکتی ہے۔ لیکن اصولی طور پر روایت نبوی اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابلِ برداشت ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف ہوسکتا ہے۔ خود اکابر حنفیہ بھی اس کے قائل نہیں نیز امام ابوحنیفہؒ نے بھی اس قسم کے عقیدہ و خیال سے تبرّی اور بیزاری ظاہر کی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ اور شامی)

اب اس کشمکش کو رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ "مسلک اعتدال" والا مضمون آئندہ تفہیمات کے اڈیشن میں شائع نہ کیا جائے اور ترجمان القرآن سے ملک، مہذب و مودب تنقیدی مضمون کی اشاعت کا موقع مرحمت فرمایا جائے۔ یہ تنقید ہمدردانہ اور جماعتی ترقی کے لیے ہوگی، مخالفانہ اور معاندانہ نہ ہوگی۔ آپ دینی فہمیدہ۔ ترجمان القرآن کی قدیمی وسعت ظرفی اور عالی ہمتی سے اس قسم کی امید وابستہ رکھنا بیجا نہ ہوگا۔

سوال :-

ارکان کو کسی نہ کسی مسلک ... تو سمجھا تھا کہ میرے آخری خط سے آپ مطمئن ہوگئے ہوں گے لیکن اب اس عنایت نامہ کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ میں آپ کو مطمئن کرنے میں ... بہا ... ہوں۔ آپ نے اب جو سوال کیا ہے اس کے سلسلہ میں میرا بھی ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ میری کتابوں میں جنھیں آپ مستقل لٹریچر فرماتے ہیں، فروع و جزئیات کے متعلق صرف یہی ایک "مسلک اعتدال" والی بحث آپ کو نظر آئی ہے یا اور بھی کسی مقام پر میں نے جزئیات و فروع سے بحث کی ہے؟ اگر دوسرے مقامات پر بھی ایسی بحثیں ہیں اور یقیناً ہیں تو جزئیات و فروع سے عدم تعرض اور ... اصول تک تقریر و گفتگو کو محدود رکھنے پر اصرار کی ضرورت آپ کو صرف اسی جگہ کیوں محسوس ہوئی؟

پھر آپ کا یہ ارشاد کہ جزئیات و فروع پر سرے سے میری کتابوں میں بحث ہی نہ ہونی چاہیے، بجائے خود صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ شاید کوئی شخص بھی مجرد کلیات تک اپنی بحثوں کو محدود رکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ کبھی کلیات و اصول کی توضیح میں اسے جزئیات سے بحث کرنی ہوگی، کبھی لوگوں کے شکوک و شبہات اور استفسارات کے جواب میں اس کی ضرورت پیش آئے گی اور کبھی خود تحقیق مسائل کے سلسلہ میں بہت سے جزئیات کو زیر بحث لانا پڑے گا اور جب یہ چیزیں بحث میں آئیں گی تو لامحالہ بہت سے امور ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی گروہ کے مسلک سے مختلف ہوں گے۔ اس لیے سرے سے آپ کا یہ مطالبہ ہی صحیح نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ آپ نے میرے پچھلے خطوط پر غور نہیں کیا۔ میں نے ان میں یہ بات عرض کی تھی کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مختلف المسالک جماعتوں اور ... اکٹھا کرنے کے لیے یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ یا تو مسائل فقہیہ پر تحقیق کی آزادی سب لوگوں سے سلب کرلی جائے، یا پہلے ان سارے مسائل کو طے کرکے ایک مسلک کی جماعت بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے صحیح یہ ہے کہ تحقیق مسائل میں سب کے لیے آزادی رہے اور صرف تحقیق ہی کے لیے نہیں بلکہ اس کے اظہار و بیان کے لیے بھی آزادی رہے اور کسی کا مسلک کسی پر مسلط نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں دستور کی جس دفعہ کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس کا منشا وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھا ہے، بلکہ اس کا منشا مناظرے اور معرکے بند کرنا ہے۔

میری پچھلی تحریروں سے جو عجیب عجیب معنی آپ نے پیدا کیے ہیں ان پر مجھے افسوس بھی ہے اور حیرت بھی۔ تعجب ہے کہ آپ دوسرے شخص کے مسلک کو سمجھنے کی کوشش کے بجائے خود اپنی بدگمانی سے ایک بات وضع کرکے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ آپ کا یہ فقرہ کہ "اصولی طور پر روایت نبوی اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابل برداشت ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف ہوسکتا ہے"، یقیناً میرے مسلک کی ترجمانی نہیں ہے۔ آپ خود ہی انصاف سے غور کیجیے کہ تفہیمات میں حدیث کے متعلق جو مضامین میں نے لکھے ہیں اور اپنی دوسری

کتابوں اور مضامین میں جس طرح میں حدیث سے استدلال و احتجاج کرتا رہا ہوں، ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد میرے متعلق یہ شبہہ کرنے کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے کہ میرا ذرہ برابر بھی میلان منکرین حدیث کے مسلک کی طرف ہو سکتا ہے؟ پھر اگر آپ مجھے مومن اور مسلمان سمجھتے ہیں تو آخر کس طرح آپ میرے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ میں کسی روایت کو فی الحقیقت حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم مان لینے کے بعد پھر اس پر فقہ یا اجتہاد کسی امام کے قول کو ترجیح دے سکتا ہوں یا اس کے ہم پلہ قرار دے سکتا ہوں؟ یہ حرکت کیا معنی، اس کا خیال کرنے کے بعد بھی کیا کوئی آدمی مومن رہ سکتا ہے؟

دراصل آپ لوگ جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ یہی ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اجتہاد و تفقہ کو حدیث رسولؐ پر ترجیح دیتے ہیں یا دونوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ اصل واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، اس کی حضورؐ کی طرف نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک محدثین کے کسی روایت کو صحیح قرار دے لازم آجاتا ہے کہ اسے حدیث رسول مان لیا جائے، لیکن ہمارے نزدیک اس سے یہ لازم نہیں آتا بلکہ اسناد کی صحت ذریعہ ہے جن سے کسی روایت کے حدیث رسولؐ ہونے کا ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس کے علاوہ متن پر کے مجموعی علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے اس کا لحاظ کرنا، اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملہ [illegible] میں قوی تر ذرائع سے جو سنت ثابتہ ہمیں معلوم ہو، اس پر نظر ڈالنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر ہم کسی حدیث کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دینا درست نہیں سمجھتے۔ بہرحال میرے عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اس امر میں نہیں ہے کہ حدیث رسول اور اجتہاد مجتہد میں مساوات ہے یا نہیں، بلکہ اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ روایات کے رد و قبول اور ان سے احکام کے استنباط میں محدثین کی رائے اور متفقہین کی رائے کا مرتبہ مساوی ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ دونوں گروہوں میں سے کس کی رائے زیادہ وزنی ہے؟ اس باب میں اگر کوئی شخص دونوں کو ہم پلہ قرار دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ لیکن آپ لوگ اس کو گنہگار بنانے کے لیے اس پر خواہ مخواہ یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ حدیث کو حدیث رسولؐ مان لینے کے بعد پھر کسی مجتہد کی رائے کو اس ..... کا ہم پلہ یا اس پر قابل ترجیح قرار دیتا ہے، حالانکہ اس چیز کا تصور بھی کسی مومن کے قلب میں جگہ نہیں پا سکتا۔

محدثین جن بنیادوں پر احادیث کے صحیح یا غلط یا ضعیف وغیرہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ان کے اندر کمزوری کے مختلف پہلو میں نے مضمون مسلک اعتدال میں بیان کر چکا ہوں۔ جن امور کو میں نے وہاں نظیر میں پیش کیا ہے وہ بیشتر علامہ ابن عبدالبر کی کتاب "جامع بیان العلم" سے ماخوذ ہیں۔ آپ براہ کرم مجھے بتائیے کہ فی الواقع کمزوری کے وہ پہلو فن حدیث میں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہیں تو پھر آخر آپ حضرات ہم سے محدثین کی آرا پر ایمان لے آنے کا مطالبہ کیوں اس شد و مد سے کرتے ہیں؟ محدثین کو بالکل ناقابل اعتنا، تو ہم نے کہا نہیں، نہ کبھی ہم اس کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس حدیث کی تحقیق میں سب سے پہلے ہم یہی دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے حدیث کا کیا حال ہے اور اس معاملہ میں جس پایہ کے محدث نے اس کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے ہم اس کی رائے کو پوری پوری وقعت بھی دیتے ہیں۔ لیکن فن حدیث کی ان کمزوریوں کی بنا پر جن کا میں نے ذکر کیا ہے ہم اس امر کا التزام نہیں کر سکتے کہ محض علم روایت کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات پر پورا پورا اعتماد کر کے ہر اس حدیث کو ضرور ہی حدیث رسول تسلیم کر لیں جسے اس علم کی رو سے صحیح قرار دیا گیا ہو۔ آپ ہماری اس رائے سے اتفاق نہ کریں جس طرح ہم آپ کی اس رائے

اتفاق نہیں کرتے لیکن اس عدم اتفاق کا نتیجہ یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ آپ ہم پر اس جرم کا الزام لگائیں جو واقعی ہم نے نہیں کیا ہے۔

آپ اگر "مسلک اعتدال" پر کوئی تنقید فرمائیں تو میرے لیے باعث شکر گذاری ہوگا۔ مجھ پر اگر میری غلطی واضح ہوگئی تو اسے مان لینے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوگا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم میں صرف اس غرض کے لیے ترجمان القرآن میں جگہ دے دوں گا کہ اس کے بعد آپ یا آپ کے ہم خیال حضرات کے لیے کسی شکایت کی گنجائش نہ رہے۔ اس امر کا فیصلہ میں مضمون کو دیکھنے کے بعد کروں گا کہ آیا مجھے اس پر کچھ عرض کرنا چاہیے یا صرف اس کو رسالہ میں شائع کر دینے پر اکتفا کرنا چاہیے۔

فرقہ بندی کے معنی

سوال:۔ آپ اپنی جماعت کے لوگوں کو سختی کے ساتھ فرقہ بندی سے منع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں میرا سوال یہ ہے کہ آخر صوم و صلوٰۃ و حج وغیرہ ارکان کو کسی نہ کسی مسلک کے مطابق ہی ادا کرنا ہوگا تو پھر بتایئے کہ کوئی مسلمان فرقہ بندی سے کیسے بچ سکتا ہے؟ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ بموجب آیت کی رُو سے کہ قرآن و حدیث کے موافق جو مسئلہ ملے اس پر عمل کیا جائے، بجز اہل حدیث کے کسی فرقہ کے ہاں جملہ جزئیات میں قرآن و حدیث سے مطابقت نہیں پائی جاتی۔ پس میں نے فی الجملہ مسلکِ اہل حدیث کو اپنے لیے پسند کیا ہے۔ پھر کیا میں بھی فرقہ بندی کے الزام کا مورد ٹھیروں گا۔

جواب:۔ فقہ میں اپنی تحقیق یا کسی عالم کی تحقیق کی پیروی کرتے ہوئے کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا جس کے لیے شریعت میں گنجائش موجود ہو، فرقہ بندی نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی قباحت واقع ہو سکتی ہے۔ اس طریقے سے مختلف لوگوں کی تحقیقات اور ان کے طرزِ عمل میں جو اختلاف واقع ہوتا ہے وہ مذموم تفرق و اختلاف نہیں ہے جس کی برائی قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ایسے اختلافات خود صحابۂ کرام اور تابعین میں رہ چکے ہیں۔ دراصل فرقہ بندی جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ فروع کے اختلافات کو اہمیت دے کر اصولی اختلاف بنا دیا جائے اور اس میں اتنا غلو کیا جائے کہ اسی پر الگ الگ گروہ بنیں اور ہر گروہ اپنے مسلک کو بمنزلۂ دین قرار دے کر دوسرے گروہوں کی تکفیر و تضلیل کرنے لگے، اپنی نمازیں اور مسجدیں الگ کر لے، شادی بیاہ اور معاشرتی تعلقات میں بھی علیٰحدگی اختیار کرے اور دوسرے گروہوں کے ساتھ اس کے سارے جھگڑے اپنی فروعی مسائل پر ہوں حتیٰ کہ اصل دین کے کام میں بھی دوسرے گروہوں کے ساتھ اس کا تعاون ناممکن ہو جائے۔ اس قسم کی فرقہ بندی اگر پیدا نہ ہو اور فروع کو صرف فروع کی حیثیت میں ہی رہنے دیا جائے تو مسائلِ فقہیہ میں مختلف مسلکوں کے لوگ اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے بھی ایک ساتھ جماعت میں منسلک رہ سکتے ہیں۔

فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کی علیٰحدگی

سوال:۔ فقہی اختلافات کی بنا پر بعض صورتوں میں حنفی، اہلحدیث اور شافعی حضرات علیٰحدہ علیٰحدہ نماز پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ اول وقت نماز پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا تاخیر کو افضل سمجھتا ہے۔ اب ان سب کا مل کر ایک جماعت میں نماز پڑھنا کسی نہ کسی کو افضل نماز سے محروم ہی کرے گا اگر "افضل نماز" کی کوئی اہمیت ہے تو پھر آپ کیوں اس "ایک ہی جماعت" کے اصول پر اتنا زور دیتے ہیں؟

جواب:۔ آپ کے نزدیک اگر کسی وقت پر نماز پڑھنا افضل اور اَولیٰ ہوا اور دوسرے مسلمانوں کے نزدیک کسی دوسرے وقت میں پڑھنا افضل ہو تو اس اختلاف کی بنا پر جماعت سے الگ ہو کر نماز پڑھنا یا اپنے ہم خیالوں کی جماعت الگ قائم کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ افضل وقت کو چھوڑنے

کی برائی سے جماعت کو ترک کرنے اور جماعتیں الگ کر لینے کی برائی زیادہ ہے۔

سوال:۔ ایک صاحب نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں آپ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ غیر صالح العقیدہ لوگوں کے پیچھے بھی عام مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھ لینی چاہیے اور تفرقہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ نے ایک خط میں ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ جس شخص کے متعلق مشرکانہ عقائد رکھنا بالکل متحقق ہو جائے اس کے پیچھے تو نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ مگر جس شخص کے عقائد کی حقیقت معلوم نہ ہو اس کی امامت میں نماز پڑھنا چاہیے۔ ان دو قول جوابات میں جو فرق ہے اس کی وجہ سے یہاں بہت پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ذرا وضاحت کے ساتھ صحیح مسلک کی نشاندہی فرمائیے۔

جواب:۔ آپ کو جو جواب یہاں سے دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی صریح مشرکانہ فعل یا قول یا عقیدہ جس کے لیے تاویل کی قطعاً گنجائش نہ ہو اور جس کے ماننے والے یا کرنے والے کے لیے یہ فیصلہ کیے بغیر چارہ نہ ہو کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، ایسے قول یا فعل کے مرتکب کے پیچھے نماز نہ پڑھنی چاہیے۔ لیکن عام طور پر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان بحثوں اور مناظروں اور نزاعوں نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ہر گروہ دوسرے کو گمراہ ٹھیرانے اور اس سے دور بھاگنے کے لیے دلیلیں ڈھونڈتا ہے اور بات بات پر فرقے بنتے ہیں، مسجدیں الگ ہوتی ہیں اور شادی بیاہ کے تعلقات منقطع ہوتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جو لوگ سب کی اصلاح کے لیے اٹھے ہوں ان کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ سب مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور ان میں جو اخلاقی اور اعتقادی خرابیاں پائیں ان کو ہمدردی اور محبت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ نمازیں الگ کر لینے کا فائدہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ ہم بھی ایک فرقہ بن کے رہ جائیں گے اور ہمارے اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی جسے عبور کرنا محال ہو جائے گا۔

رہا یہ اندیشہ کہ جس شخص کو آپ اپنے نزدیک گمراہی اور شرک میں مبتلا پاتے ہیں اس کی نماز چونکہ آپ کے عقیدہ کے مطابق مقبول نہیں ہے اس لیے اگر آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو آپ کی نماز نہ ہوگی، تو یہ اصلاً غلط ہے۔ اوّل تو آپ یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہی نہیں ہیں کہ کس کی نماز مقبول ہوگی اور کس کی نہ ہوگی ایسے فیصلے کرنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی دعا کریں اور دوسروں کی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی۔ دوسرے یہ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پوری جماعت کی نماز امام کی نماز کے ماتحت ایک مجموعی شکل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوتی ہو اور اگر امام کی نماز مقبول نہ ہو تو سارے مقتدیوں کی نماز بھی غیر مقبول ہو جائے۔ جماعت کی پابندی تو مسلمانوں کو ایک امت بنانے کے لیے ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کی نماز انفرادی حیثیت ہی سے خدا کے حضور پیش ہوتی ہے اور اگر وہ مقبول ہونے کے قابل ہو تو بہرحال مقبول ہو کر رہتی ہے خواہ امام کی نماز مقبول ہو یا نہ ہو۔

سوال:۔ یہ تعلق جس فرقے سے تھا اس کے بعض سنجیدہ علماء یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آپ فقہی مسلک میں ارکان کو آزادی دیتے ہیں اور واقعۃً جزئی معاملات میں مختلف گروہ متحد الخیال ہیں بھی نہیں تو پھر آپ نماز کی جماعت میں سب کی شرکت کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں؟ خود نماز سے متعلقہ مسائل میں بہت اختلافات ہیں اور ان کی بنا پر لوگ اپنی نمازیں الگ پڑھنا چاہتے ہیں:

جواب:۔ فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کو الگ کرنے کا کوئی ثبوت سلف میں نہیں ہے۔ یہ فقہی اختلافات صحابہ کرام کے درمیان بھی تھے اور تابعین کے درمیان بھی اور تبع تابعین کے درمیان بھی، لیکن یہ سب لوگ ایک ہی جماعت میں نماز پڑھتے تھے۔ یہی طریقہ ائمہ مجتہدین کا بھی رہا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ نماز دین کی بنیادوں میں سے ہے اور فقہی اختلافات بہرحال فروعی ہیں۔ ان فروعی اختلافات کی بنا پر نمازیں الگ کرنا تفرق فی الدین ہے جس کو قرآن نے گمراہی قرار دیا ہے۔ نمازیں الگ کر لینے کے بعد مسلمانوں کی ایک امت نہیں رہ سکتی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ جو لوگ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے وہ دین کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کی سعی میں متحد ہو کر کام کر سکیں گے۔ یہ چیز اب نظری نہیں رہی ہے بلکہ صدیوں کے عملی تجربہ نے اسے ثابت کر دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنے فرقی اختلافات کی وجہ سے نمازوں کی علیحدگی پر اصرار کرتے ہیں وہ دراصل دین کی جڑ پر ضرب لگاتے ہیں۔